Dr. Shyama Prasad Mukerjee University , Ranchi

BA Semester-1(URD-HC-101)

End sem -80 **Session(2021-2024)**

Total Mark.100 **Internal Assesment-20**

Unit.1

غزل کی تعریف، ہیئت اور صنفی خصوصیات

غزل اردو شاعری کی سب سے مقبول صنفِ سخن ہے اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اسے عام طور پر اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ اردو میں جب سے تنقید کا باقاعدہ آغاز ہوا اس وقت سے لے کر اب تک غزل طرح طرح کے اعتراضات کا نشانہ بنتی رہی لیکن اس کی مقبولیت کم ہونے کے بجائے برابر بڑھتی ہی گئی اور یہ ثابت ہو گیا کہ غزل میں زمانے کے ساتھ بدلنے، ہر ضرورت کو پورا کرنے اور ہر طرح کے مضمون کو ادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اور اب یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس صنفِ سخن کو کبھی زوال نہ ہوگا۔

غزل عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کی باتیں کرنا۔ اس صنف کو غزل کا نام اسی لیے دیا گیا تھا کہ حسن و عشق ہی اس کا خاص موضوع ہوتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات میں وسعت (پھلاؤ) پیدا ہوتی گئی اور آج غزل میں ہر طرح کے مضمون کو پیش کرنے کی گنجایش ہے۔ غزل کی ابتدا عرب میں ہوئی۔ وہاں سے یہ ایران پہنچی اور فارسی میں اس نے بہت ترقی کی۔ فارسی ادب کے راستے یہ اردو ادب میں داخل ہوئی اور دھریے دھریے خاص و عام میں مقبول ہو گئی۔

غزل کی خصوصیات:۔

غزل کے تمام مصرے ایک ہی وزن اور ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔ غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے اور اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ یا ہم ردیف ہوتے ہیں۔ ردیف وہ لفظ یا الفاظ کا وہ مجموعہ ہے جسے ہر شعر کے آخر میں دہرایا جائے۔ اس سے پہلے قافیہ ہوتا ہے جس کا آخری حرف یا اخر کے چند حرف یکساں ہوتے ہیں جیسے: دوا، ذرا یا میر، پیر۔ بعض غزلوں میں قافیے کے ساتھ ردیف بھی ہوتی ہے۔ بعض میں صرف قافیہ ہوتا ہے۔ غزل کا آخری جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ ان کی مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

ہم نے مانا کچھ نہیں غالبؔ　　مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اس طرح ہم دیکھتے ہے کہ اس شعر کا پہلا شعر مطلع ہے اور تیسرا شعر مقطع۔ ''کیا ہے'' ردیف ہے جو مطلع کے دونوں مصرعوں اور باقی اشعار کے دوسرے مصرعوں کے آخر میں دہرائی گئی ہے۔ ہوا، دوا، ماجرا، برا، قافیہ ہیں۔

غزل کی دیگر اہم خصوصیات یہ ہیں کہ غزل کا ہر شعر اپنے معنی الگ دیتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو یا دو سے زیادہ شعر مل کر معنی دیتے ہیں تو انھیں قطعہ بند کہا جاتا ہے۔ مثلاً میرؔ کے یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیں:۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا　　یکسر وہ استخوانِ شکستہ سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر　　میں بھی کبھی کسو کا سرِ پُرغرور تھا

عام طور پر غزل کے شاعر کو دو مصرعوں میں مکمّل مضمون ادا کرنا پڑتا ہے اس لیے وہ اختصار اور رمز و کنایا سے کام لینے پر مجبور ہے۔

دوسری خاص بات یہ ہے کہ قصیدے اور مثنوی کی طرح غزل خارجی نہیں بلکہ داخلی صنفِ سخن ہے اور شاعر اس میں وہیں بیان کرتا ہے جو اس کے دل پر گزرتی ہے۔ اس لیے غزل کے خاص موضوعات حسن و عشق ہیں۔

ایک اور بات یہ کہ غزل کا شاعر عام طور پر نرم، سبک اور شیریں الفاظ کا استعمال کرتا ہے حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ شاعر ہر طرح کا لفظ استعمال کر سکتا ہے بشرطیکہ اسے لفظوں کے استعمال کا سلیقہ ہو۔ بہر حال غزل ایک غنائی صنفِ شاعری ہے اور ترنم و موسیقی سے اس کا گہرا تعلق ہے اس کا گہرا تعلق ہے۔ یہی سبب ہے کہ مشاعرے بہت مقبول رہے ہیں اور ان میں غزلوں کی فرمایش کی جاتی رہی ہے۔

غزل کا ارتقا۔

اردو شاعری کا بیشتر سرمایہ غزل پر مشتمل ہے اور تقریباً تمام شاعروں نے غزلیں کہی ہیں لیکن یہاں صرف صفِ اوّل کے غزل گو شعراء کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ دکن کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ غزل گو بھی تھا لیکن اس صنف میں جن دکنی شعراء نے خاص طور پر نام پیدا کیا ان میں سراجؔ اور ولیؔ دکنی قبلِ ذکر ہیں۔ شمالی ہند کے فارسی شعراء ولیؔ کا کلام دیکھ کر ہی اس طرف متوجہ ہوئے۔ ان میں شاہ حاتم، شاہ مبارک آبروؔ، مرزا مظہر جانِ جاناں کے نام اہم ہیں۔ اس کے بعد غزل کے سنہری دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور کے لافانی شاعر ہیں میرؔ، سوداؔ، اور دردؔ۔ اس کے بعد دلی کے اجڑنے پر لکھنؤ میں شاعری کی محفل جمتی ہے۔ یہاں کے شاعروں میں مصحفیؔ، انشاءؔ اور جرأتؔ قابل ذکر ہیں۔ ان کی غزلوں کا انداز شعرائے دہلی کی غزلوں سے مختلف ہے۔ اس کے بعد دہلی میں شعر و شاعری کی محفلیں پھر سے آراستہ ہوتی ہیں۔ غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالبؔ نے غزل کے موضوعات کو وسعت دی اور اسے فکر سے آشنا کیا۔ ذوقؔ نے زبان پر زیادہ

زور دیا۔ مومنؔ نے معاملاتِ عشق میں نام حاصل کیا۔ اقبال نے غزل میں فلسفہ پیش کر کے ایک نئے انداز کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد اصغرؔ، فانی، شاد، حسرتؔ، آرزوؔ، یگانہؔ اور جگرؔ نے غزل کو فروغ دیا۔ پھر فراقؔ، فیض، جوش، پرکاش فکری وغیرہ کا نام اہمیت کا حامل ہیں۔

Unit. 3

ولیؔ (۱۶۵۰ تا ۱۷۲۰ء اور ۱۷۲۵):۔

اردو شاعری میں ولیؔ کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ انھیں اردو شاعری کا بابا آدم کہا گیا ہے جو اس لحاظ سے تو غلط ہے کہ ان سے پہلے اس زباب میں جسے آگے چل کر اردو کہا گیا شعر کہنے کی روایت اچھی طرح جڑ پکڑ چکی تھی اور شعر و ادب کا ایک بڑا ذخیرہ وجود میں آچکا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کا چرچا انہی کے دم سے ہوا۔

اس زمانے میں اس عوامی زبان کو ریختہ کہا جاتا تھا جس کے معنی گرے پڑے کے ہیں۔ گویا اس زبان کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ کبھی کبھار اس زبان میں بھی شعر کہے جاتے تھے مگر تفریح کے طور پر ۱۷۰۰ء میں ولیؔ دہلی آئے اور لوگوں نے ان کا کلام سنا تو انھیں حیرت بھی ہوئی اور مسّرت بھی کہ اس زبان میں اعلیٰ درجے کی شاعری بھی ممکن ہے۔

دہلی میں ولیؔ کی ملاقات سعد اللہ گلشن سے ہوئی درجے کی شاعری بھی ممکن ہے۔ ایک تو یہ کہ دکنی الفاظ کا استعال کم کرو اور ان کی جگہ فارسی کے شیریں الفاظ کا انتخاب کرو۔ دوسرے یہ کہ فارسی شاعری میں جو مضامین موجود ہیں انھیں اپنی زبان میں ادا کرو۔ یہ دونوں مشورے اردو شعر و ادب کی تاریخ میں رنگ میل ثابت ہوئے۔ فارسی شاعری کے مضامین سے فائدہ پہلے بھی اٹھایا جارہا تھا اور فارسی الفاظ بول چال کے مقامی الفاظ کے ساتھ پہلے بھی شیر و شکر ہو رہے تھے۔ اب شاعری میں اس کا شعوری طور پر آغاز ہوا۔ اور اس کی شروعات کا سہرا ولیؔ کے سر ہے۔ محمد حسین آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں کہ ولیؔ نے ایک زبان کو دوسری سے ایسا بے معلوم جوڑ لگایا کہ آج تک زمانے نے کئی پلٹے کھائے مگر پیوند میں جنبش نہیں آئی۔

دہلی سے دکن لوٹ کر ولیؔ نے اپنا کام جاری رکھا۔ انھوں نے شمالی ہند کی عوامی زبان، دکنی اور فارسی کی آمیزش سے ایک نئی زبان کو جنم دیا۔ اس وقت دکن اور سمالی ہند ایک ہو چکے تھے اور اس نئی زبان کے لیے زمین پوری طرح تیار تھی۔ چنانچہ ولیؔ کے دہلی سے لوٹنے کے انیس برس بعد جب ان کا دیوان یہاں پہنچا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ولیؔ کے کلام سے شعائے دہلی پہلے ہی واقف ہو شکے تھے لیکن اب یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں کھل گئیں کہ وہ گری پڑی زبان جسے اہلِ علم حقارت سے ریختہ کہتے تھے اپنے اندر امکانات رکھتی ہے اور اس میں اتنی بلند پایہ شاعری کی جاسکتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف اس زبان میں شاعری کا چرچا ہو گیا۔

ولی نے اپنی زبان اور اس کے مزاج کا خیال رکھتے ہوئے شاعری کے لیے عربی اور فارسی بحروں کا انتخاب کیا۔ فارسی کی جو ترکیبیں یہاں کھپ سکتی تھیں ان کا استعمال کیا اور نئی ترکیبیں وضع کیا۔ فارسی کے اثر سے ایک فائدہ اور ہوا، اردو شاعری میں اب تک جو سطحیت تھی وہ دور ہوگئی۔

ولیؔ نے متعدد شعری اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن غزل کو خاص طور پر اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اس کے دامن کو وسیع کیا۔ ولیؔ کی زبان سادہ اور سہل ہے لیکن اس کی سادگی میں بھی حسن ہے۔ انھیں پیکر تراشی میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ خوبصورت تشبیہیں اور استعارے استعمال کرنے کا انھیں خوب سلیقہ ہے۔ ملاحظہ ہوں ان کے چند اشعار ؎

کیا مجھ عشق نے ظالم کو آب آہستہ آہستہ
کہ آتش گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل روسوں
خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

اداو ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سوں
کہ جیوں مشرق سے نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

ولیؔ مجھ دل میں آتا ہے خیالِ یارِ بے پروا
کہ جیوں انکھیاں منیں آتا ہے خواب آہستہ آہستہ

میر تقی میرؔ (۱۷۲۲/۲۳ء۔۱۸۱۰ء):۔

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے (میرؔ)

میر تقی میرؔ کا شمار اردو کے عظیم شعراء میں کیا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک تو وہ اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ بڑے بڑے اساتذۂ فن نے میرؔ کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کی عظمت کا اصل راز یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دل پر گزری ہوئی واردات سیدھی سادی اور بول چال کی زبان میں ادا کر دی۔ یہ واردات وہ تھی جو ہر دل پر گزر جاتی ہے۔ اس لیے جس نے بڑھا یا سنا اسے اپنے دل پر گزری ہوئی معلوم ہوئی۔ اسی لیے تو کہا گیا کہ میرؔ نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا۔

میرؔ کی زندگی آلام و مصائب میں بسر ہوئی۔ یہی آلام و مصائب شعر کے سانچے میں ڈھل گئے تو ہر ایک کو ان میں کشش نظر آئی۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں میرؔ کے حالاتِ زندگی پر مختصر نظر ڈالتے چلیں۔

ان کا نام محمد تقی تھا۔ ولادت آگرہ میں 23-1722ء میں ہوئی۔ دادا بھی فوج کی ملازمت میں تھے اور آگرہ کے

نزدیک تعینات تھے۔ میرؔ کے والد محمد علی صوفی منش انسان تھے۔ اور معاملاتِ دنیا سے سروکار نہ رکھتے تھے۔ صوفیا کی خدمت میں حاضری کو سعادت جانتے تھے۔ نہایت متقی انسان تھے اس لئے علی متقی کہلائے۔ پہلی شادی خان آرزوؔ کی بہن سے ہوئی تھی۔ ان سے ایک بیٹا تھا جس کا نام محمد حسن تھا دوسری شادی میر کی والدہ سے ہوئی۔ ان سے تین اولادیں تھیں۔

علی متقی اپنے بیٹے محمد تقی کو اپنی راہ پر چلانے کی تمنّا رکھتے تھے۔ شیر خوار بچّے کو اپنی گود میں لے کر ٹہلتے تو کہا کرتے بیٹا عشق کرو عشق کیوں کہ دنیا میں عشق کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے چہرے کی زردی کو عشق کی علامت سمجھتے اور یہ سوچ کر خوش ہوتے کہ خدا نے ان کے نونہال کو عشق کی نعمت سے نوازا ہے۔

امان اللہ جنھیں اردو دنیا میر کے منھ بولے چچا کے نام سے جانتی ہے علی متقی کے مرید تھے۔ علی متقی انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ امان اللہ اپنے مرشد کے کم سن بیٹے کو بہت چاہتے تھے اور انھیں لے کی صوفیوں کی خانقاہوں میں حاضر ہوتے تھے۔ میرؔ کے مزاج میں بد دماغی کی حد تک جو بے نیازی تھی اس میں ان خانقاہوں کی تربیت کا بھی بڑا حصہ تھا۔

محمد تقی نے ابھی پوری طرح ہوش بھی نہ سنبھالا تھا اور ان کی عمر ابھی گیارہ برس کی بھی نہ ہوئی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور منھ بولے چچا نے دنیا کو خیر باد کہہ دیا اب یہ بالکل بے سہارا رہ گئے۔ سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن سے حسن سلوک کی امید ہو سکتی تھی مگر باپ کے مرتے ہی انھوں نے آنکھیں پھیر لیں۔

محمد تقی روزی کی تلاش میں آگرہ سے دہلی پہنچے۔ کچھ دن پریشاں حالی میں گزارے۔ آخر صمصام الدولہ نے ایک روپیہ روز وظیفہ مقرر کر دیا مگر کچھ ہی دنوں بعد صمصام الدولہ کا انتقال ہو گیا اور یہ وظیفہ بھی باقی نہ رہا۔ روزی کی طرف سے بے فکر ہو کر وہ آگرہ لوٹ آئے تھے۔ اب دوبارہ دہلی کا رخ لیا۔ اس بار سوتیلے بھائی کے ماموں خان آرزوؔ کے یہاں ہی کہنے لگے تھے۔ خان آرزوؔ کی توجہ سے ان کے فنِّ شعر گوئی پر صیقل ہو گئی اور وہ محمد متقی سے میرؔ ہو گئے۔ میرؔ ان کا گھر چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور آخر کار ذہنی توازن کھو بیٹھے۔

دیوانگی دور ہونے پر پھر روزگار کی تلاش ہوئی۔ آخر رعایت خاں سے توسّل ہو گیا مگر نازک مزاجی نے نباہ نہ ہونے دی۔ اس کی ملازمت ترک کر کے ایک امیر جاوید خان کے ملازم ہو گئے۔ اسی اثنا میں احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو تاراج کر دیا۔ دہلی اجڑی تو میرؔ لکھنؤ آ کر نواب آصف الدولہ کے دربار میں ملازم ہو گئے۔ عمر کے آخری اکتیس برس وہاں گزار کر 1810ء میں انتقال کر گئے۔

میرؔ کی زندگی کے مصائب جن کی تفصیل اوپر گزری ان کے شعروں میں ڈھل گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بلا کا درد پایا جاتا ہے اور کلامِ میرؔ میں پایا جانے والا یہی درد ہے جس نے ان کی شاعری کو اتنا مقبول اور ہر دل عزیز بنا دیا کہ تقریباً دو سو برس بعد بھی یہ ہر دل کو تڑپا دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

میرؔ کی شاعری کا دوسرا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بول چال کی زبان کو ایسے سلیقے سے استعمال کیا کہ وہ شاعری کی زبان بن گئی۔ مطلب یہ کہ وہ آسان اور عام فہم زبان تو استعمال کرتے ہیں مگر تمام شعری وسائل کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ ہلکی ہلکی موسیقی اور نرم لہجے نے بھی ان کی مقبولیت میں اضافہ کیا ہے۔ ان کی شاعری میں خود کلامی پائی جاتی ہے۔ گویا شاعر اپنے آپ سے ہی باتیں کرتا ہے۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جن کے سبب میرؔ کا کلام آج بھی جادو کا اثر رکھتا ہے اور آیندہ بھی اس کی یہ تاثیر باقی رہے گی۔

میرؔ نے متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی۔ انھوں نے مرثیے بھی کہے اور بہت اچھی مثنویاں بھی لکھیں مگر ان کا اصل کارنامہ ان کی غزل ہے۔ ملاحظہ ہو ان کی غزلوں کے چند اشعار:۔

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

آتشؔ (۱۷۷۸ء۔ ۱۸۴۷ء)

آتشؔ کا نام خواجہ حیدر علی آتش تھا۔ آپ خواجہ علی بخش کے بیٹے تھے۔ دہلی کے ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بزرگوں کا وطن بغداد تھا جو تلاش معاش میں شاہجہان آباد چلے آئے۔ ان کے والد دہلی سے آکر فیض آباد میں بس گئے تھے۔ یہیں حیدر علی کی ولادت ہوئی۔ کم سنی میں باپ کے سایے سے محروم ہو گئے اس لیے تعلیم جیسی ہونی چاہیے تھی، نہ ہو سکی۔

بچپن میں اچھی طرح دیکھ بھال نہ ہونے سے مزاج میں آزادہ روی پیدا ہو گئی تھی۔ سپاہیوں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے تھے اس لیے بچپن میں تلوار چلانا سیکھ گئے تھے۔ ہوش سنبھالا تو فیض آباد میں نواب محمد تقی خان بہادر کے یہاں تلوار بازوں میں ملازم ہو گئے۔ پھر انھی کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے۔

آتشؔ لکھنؤ پہنچے تو یہاں ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ خود بھی شعر کہنے لگے۔ مصحفیؔ کی شاگردی اختیار کی۔ آتشؔ کی تعلیم تو مکمّل نہ ہوئی تھی لیکن شعر سے طبعیت کو مناسبت تھی۔ پھر قسمت سے مصحفیؔ جیسا استاد میسّر آیا جس نے بہت توجہ سے شاگرد کی تربیت کی۔ چھپا ہوا جوہر جلد ہی نمودار ہو گیا اور آتشؔ کا ملانِ فن میں شمار کیے جانے لگے۔ اس کے باوجود انھوں نے کسی سرکار کسی دربار سے وابستہ ہونا پسند نہیں کیا۔ آزادانہ و درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مسجد میں چٹائی پر بیٹھے رہتے تھے اور اچھے اچھوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

آتشؔ فقیرانہ زندگی گزارتے تھے۔جسم پر گیروے رنگ کا لمبا چغہ ہوتا تھا اور ہاتھ میں موٹا ڈنڈا۔کمر سے تلوار لٹکی رہتی تھی۔بنگ پیے کے عادی ہو گئے تھے۔دنیا سے بے خبر عالمِ خیال میں کھوئے رہتے تھے۔

آتشؔ کی شاعری

آتشؔ کا اردو کے شیریں کلام شاعروں میں شمار ہے۔ان کی شاعری میں زبان کا حسن اور جزبے کی صداقت دونوں گھل مل جاتی ہیں اور یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ان کا ایک شعر ہے ۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتشؔ مصّع ساز کا

یہی ''مرصّع سازی'' ہے جس نے لکھنؤ کو دہلی سے ممتاز کر دیا لیکن آتش کی اصل اہمیت اس میں ہے کہ 'مرصّع سازی' کے علاوہ بھی ان کی شاعری میں بہت کچھ ہے۔

آتشؔ کی شاعری میں رنگِ ناسخؔ کی جھلک نظر آتی ہے یعنی زبان کی طرف زیادہ توجہ صنائع کا اہتمام اور مضمون آفرینی۔

لیکن وہ مضمون کی طرف سے بھی غافل نہیں رہتے۔چنانچہ ان کے دیوان میں بکثرت ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو ان کی بلند خیالی کے گواہ ہیں گویا آتشؔ کے اشعار ناسخؔ کے کلام کی طرح جزبات و احساسات سے خالی نہیں ہیں۔ان کے مزاج میں جو بانکپن اور بے نیازی ہے وہ ان کے شعروں میں بھی جھلکتی ہے۔ان کے خیالات بلند اور زبان دلکش ہے۔اردو شاعری میں ان کا لہجہ الگ پہچانا جاتا ہے۔نمونہ کلام ۔

جہاں و کارِ جہاں سے ہوں بے خبر میں مست — زمیں کدھر ہے کہاں آسماں نہیں معلوم
زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا — بدلتا ہے رنگ آشماں کیسے کیسے
نہ گورِ سکندر، نہ ہے قبرِ دارا — مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

آتشؔ کے کلام کو پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں غم و درد کا ذکر بہت کم ہے اور جو تھوڑا بہت ہے بھی وہ زندگی سے بیزاری اور مایوسی نہیں سکھاتا بلکہ ان کا توانا اور پر جوش لہجہ مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے پر ابھارتا ہے۔ان کے کلام میں ایک سرمستی کی کیفیت ملتی ہے ان کی شخصیت میں جو شجاعت اور جوانمردی اور قوت و عظمت تھی اس کا بھرپور اظہار ان کے اشعار میں ملتا ہے۔مثلاً

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ تھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

دلِ بے تاب کو فریاد وفغاں کرنے دو
پہلے غماز ہی کو قصہ بیاں کرنے دو

آتش اپنی قوت تخیل کے زور سے اشعار میں ایسی رنگارنگی، دلکشی اور رعنائی بھر دیتے ہیں جو قاری کے ذہن کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ آتش کا دیوان پڑھیے تو احساس ہوتا ہے کہ عام طور پر آتش اپنی غزلوں کے مطلع سے ہی ہمیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

ان کے مطلع نہایت زوردار ہوتے اور پہلی ہی آواز میں ہم پر ایسا تاثر چھوڑتے ہیں جو پوری غزل پر حاوی ہوتا ہے۔ غزل میں ایک ہی فضا ایک ہی موڈ اور کیفیات کی وحدت کے لیے مطلعوں سے بہت مدد ملتی ہے۔ دراصل آتش کی کلام میں رنگینی شامل ہوتی ہے۔ مثلاً

ایسی وحشت نہیں دل کی کہ سنبھل جاؤں گا
صورت پیرہن تنگ نکل جاؤں گا
تصور سے کسی کے کی ہے میں نے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویر خیالی روبرو برسوں

آتش نے اپنے تفربات واحساسات کے اظہار کے لیے جہاں بھی اس وسیلے کی تلاش کی ہے وہاں ان کے ہاں اپنی شخصیت کے وجدانی اور جمالیاتی، عناصر کی مدد سے تشبیہات واستعارات کے حسن کاری نمایاں طور پر موجود ہے۔

یہ آرزو تھی کہ تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

آتش بنیادی طور پر عشق وعاشقی کے شاعر ہیں لیکن ان کی عشقیہ شاعری میں وہ ابتذال نہیں جو عام لکھنوی شعراء کے ہاں موجود ہے۔ اس کے برعکس ان کے ہاں تہذیب اور نفاست کا احساس ہوتا ہے وہ محبوب کے کاکل ورخسار کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے احساسات وجذبات کی بھی ترجمانی ان کے ہاں ملتی ہے لیکن عامیانہ پن سے وہ اپنے دامن کو آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ ان کا محبوب شائد بازاری نہیں اس لئے ان کی شاعری میں جنسیت کی کارفرمائی کا احساس بھی ملتا ہے لیکن اس میں ابتذال اور سوقیانہ پن نہیں ہے بلکہ جنس کا صحت مند تصور ان کے ہاں ملتا ہے۔

آتش کا محبوب بھی کوئی تخلیقی مخلوق نہیں بلکہ ہماری ہی دنیا کا جیتا جاگتا انسان ہے جو خود بھی محبت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی محبت میں ہوسنا کی نہیں بلکہ اس میں سچائی اور خلوص کی آنچ موجود ہے۔

چمن میں شب کو وہ شوخ بے نقاب آیا

یقین ہو گیا شبنم کو آفتاب آیا

آتش کو اخلاقی شاعری کا بادشاہ کہا گیا ہے۔ اور اسی خصوصیات نے ان کے کلام میں ایسے اشعار کا بیش بہا خذانہ جمع کر دیا ہے اور وہ ایسی سچائیوں کا آئینہ بھی بنتے ہیں کہ سننے والوں نے انہیں خدجاں بنایا ہے۔

؎ وفا سرشت ہوں شیوہ ہے راستی میرا

نہ کی وہ بات جو دشمن کو ناگوار ہوئی

آتش کے کلام میں ترشے ہوئے الفاظ آبدار موتی کی طرح لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اکثر اشعار میں روانی، موسیقیت کی جد تک پہنچ گئی ہے۔ آتش کی شاعری میں نہ شدید غم ہے نہ لکھنؤ جیسی خوشی اور سرمستی ہے ان کی شاعری میں سرور اور ایک خاص قسم کی راحت کا احساس ہے ان کے یہاں مہذب قسم کی زندہ دلی ہے پر امید ہونے کے ساتھ ساتھ عمل کی تعلیم اور تلیقن بھی پائی جاتی ہے۔ آتش کے کلام میں سادگی، روانی اور ترنم کا ذکر خاص طور پر نمایا نظر آتا ہے۔

ہوائے دور مئے خوشگوار راہ میں ہے

خزاں مچن سے بے جاتی بہار راہ میں ہے

تاریخ ادب اردو میں رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں،

''میر و غالب کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ آتش ہیں۔''

مزید لکھتے ہیں کہ:۔ ''آتش کے ہاں صفائی اور محاورات کا بہترین تصرف ہے۔''

Unit.4

ولی دکنی کی پہلی غزل کی تشریح:۔

۱۔ جسے عشق کا تیر کاری لگے

اسے زندگی کیوں نہ بھاری

تشریح:۔ مطلع کے اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ جسے عشق کا کارگر تیر لگ جائے اس کے لیے زندگی دُشوار ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے زندگی گویا آسان نہیں رہتی۔ یعنی جو ایک بار عاشق ہو جاتا ہے وہ پھر مُشکلوں اور مصیبتوں سے بچ نہیں سکتا۔

۲۔ نہ جھوڑے محبت دم مرگ لگ

جسے یار جانے سوں یاری لگے

تشریح:۔اس شعر میں کہا گیا ہے کہ ایک بار جو معشوق کو اپنا بنا لیتا ہے، اس سے محبت کر بیٹھتا ہے اور پھر مرتے دم تک اس محبت کو چھوڑ نہیں پاتا۔

۳۔ نہ ہووے اس جگ میں ہرگز قرار

جسے عشق کی بے قراری لگے

تشریح:۔اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ جس کو ایک بار عاشق کی بے قراری لگ جاتی ہے جو ایک بار عشق کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔اسے پھر دنیا میں کہیں بھی اور کبھی بھی قرار میّسر نہیں آ سکتا۔

۴۔ ہر ایک وقت مجھ عاشق زار کوں

پیاری! تیری بات بیاری لگی

تشریح: ۔اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اے میری پیارے، مرے محبوب میں تمہارا زبردست چاہنے والا ہوں اور مجھے تمہاری ہر بات بہت پیاری، بھلی لگتی ہے۔

۵۔ ولؔی سوں کہے تو اگر اِک بچن

رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

تشریح:۔ مقطع کا اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اگر تو ایک لفظ ولؔی کو مخاطب ہو کر کہہ دے تو سارے رقیبوں کے دلوں پر چُھوریاں چل جائیں۔

ولی دکنی کی دوسری غزل کی تشریح:۔

۱۔ کوچہ یار عین کاسی کا ہے

جوگی دل وہاں کا باسی ہے

تشریح:۔اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ محبوب کا کوچہ عاشق کے لیے کسی تیرتھ استھان سے کم نہیں ہوتا ہے لہٰذا شاعر کہتا ہے کہ میرے محبوب کا کوچہ کاشی کی مانند ہے اور میرا دل ہواں کا رہنے والا ہے۔کاشی ہندوؤں کا ایک ترتھ استھان ہے۔ شاعر نے محبوب کے کوچے کو کاشی سے تشبیہ دی ہے۔

۲۔ پی کے بیراگ کی اداسی ہوں

دل یہ میرے سدا اداسی ہے

تشریح:۔اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی جدائی کی مایوسی کے سبب سے میرے دل پر ہمیشہ اداسی چھائی رہتی

ہے۔

۳۔ اے صنم! تجھ جبیں اپر یہ خال

ہندوئے ہردوار باسی ہے

تشریح:۔شاعر محبوب سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ اے محبوب تمہارے ماتھے پر جو یہ سیاہِ تل ہے یہ ایسا لگتا ہے کہ کوئی ہندو ہردوار پر باس کررہا ہو۔محبوب کی پیشانی کو شاعر نے ہردوار اور تِل کو ہندو سے تشبیہ دی ہے اور وہ اس لئے کہ ہندو کے معنی سیاہ کے بھی ہوتے ہیں۔

۴۔ زلف تیری ہے موج جمنا کی

تل نازک اس کے جیون سناسی ہے

تشریح:۔اس شعر میں شاعر محبوب سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ تمہاری زُلف دریائے جمنا کی موج کی طرح ہے اور اس کے نزدیک جو تلِ ہے وہ جیسے کوئی جمنا کے کنارے بیٹھا سنیاسی ہو(جمنا بھی ہندوؤں میں مُتبرک دریا مانا جاتا ہے)۔

۵۔ یہ سیہ زلف تجھ زخنداں پر

ناگنی جیوں کنوے پہ پیاسی ہے

تشریح:۔اس شعر میں شاعر محبوب سے مخاطب ہے اور کہتا ہے کہ تمہاری ٹھوڈی تک آئی یہ زلف ایسی بے قرار ہے جیسے کوئی ناگنی کنویں پر پیاسی ہو۔سانپ میں ویسے ہی قرار نہیں ہوتا اس پر پیاس ہو اور پانی سامنے ہو مگر اس تک پہنچ نہ پائے تو کیا حالت ہوگی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔سانپ سے زلف کو تشبیہ دیتے ہیں مگر جس طرح ولی نے پیاسے سانپ سے محبوب کی بے قرار زلف کو تشبیہ ہے۔یہ بے مثال ہے۔

۶۔ جس کی گفتار میں نہیں ہیں مزا

سخن اس کا طعام باسی ہے

تشریح:۔اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ جس کے کلام میں تاثیر نہیں ہے، مزہ نہیں ہے۔اس کا کلام باسی کھانے کی طرح ہے کہ وہ کہ جس طرح باسی کھانا بے مزہ ہوتا ہے اس طرح اس کا کام بھی مزہ نہیں دیتا۔

۷۔ اے ولی! جو لباس تن پہ رکھا

عاشقوں کے نزک لباسی ہے

تشریح:۔غزل کے مقطع میں شاعر خود سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ عشق کو آرائش سے مطلب نہیں ہوتا۔اس کی پہچان تو اس کا چاک گریبان ہوتا ہے۔لہٰذا جو شخص بہتر لباس کا خیال رکھتا ہے وہ عاشقوں کے نزدیک عاشق نہیں ہے بلکہ وہ تو دنیاوی، دنیا کا باشندہ ہے،جس کو عشق سے سروکار نہیں۔

میرؔ کی غزل کی تشریح:۔

۱۔ ہستی اپنی حباب کی سی ہے

یہ نمائش سراب کی سی ہے

تشریح:۔میرؔ زندگی کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس شعر میں کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی بڑی مُختصر ہے۔ایک بُلبُلے کی مانند ہے کہ جو پل میں ختم ہو جاتا ہے۔اس کی ساری نمائش اور رنگینی سراب کی مانند ہے یعنی دھوکہ ہے۔

۲۔ نازکی اس کے لب کی کیا کہیے

پنکھڑی اک گُلاب کی سی ہے

تشریح:۔اس شعر میں شاعر محبوب کی خوبصورتی کا تزکرہ کر رہا ہے ہونٹوں کا نازک ہونا خوب صورتی کی دلیل ہے۔آپ شاعر کہتا ہے کہ میرے محبوب کے ہونٹ اتنے نرم و نازک ہیں کہ ان کا بیان مشکل ہے۔انھیں گُلاب کی پنکھڑی کہیں تو بجا ہے۔

۳۔ بار بار اس کے در پہ جاتا ہو

حالب اب اضطراب کی سی ہے

تشریح:۔اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ میری حالب اس قدر بے قرار ہو گئی ہے کہ مایوسیوں اور ناکامیوں کے باوجود میں بار بار محبوب کے در پر جاتا ہوں اور اسی طرح اپنے حواری کا سامان کرتا ہوں۔

۴۔ میں جو بولا،کہا کہ یہ آواز

اسی خانہ خراب کی سی ہے

تشریح:۔اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ محبت میں ہم نے اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ہم آوارہ ہو گئے۔اب محبوب اسی حوالے سے طنز کرتا ہے کہ میری آواز سنتے ہی اس نے فوراً کہا کہ یہ آواز تو اسی خانہ خراب کی سی لگتی ہے۔

۵۔ میر!ان نیم باز آنکھوں میں

ساری مستی شراب کی سی ہے

تشریح:۔ مقطعے میں شاعر کہتا ہے اے میر، محبوب کی ان نیم باز گویا آدھی کُھلی آدھی بند آنکھوں میں وہ کیفیت ہے جیسے پورے مے جانے کی مستی ان میں سما گئی ہے۔

آتش کی غزل کی تشریح:۔

۱۔ یہ آرزُو تھی تجھے گُل کے رُوبرُو کرتے
ہم اور بُلبُل بے تاب گُفتگو کرتے

تشریح:۔ بُلبُل گُل کا عاشق ہے۔ اس کے نزدیک پھول سب سے حسین ہے۔ ادھر شاعر اپنے محبوب کو سب سے زیادہ حسین خیال کرتا ہے۔ اب وہ کہتا ہے کہ ہماری یہ خواہش تھی کہ اے محبوب تجھے گُل کے سامنے بٹھاتے اور پھر ہم بُلبُل سے بات کرتے کہ بتا کون زیادہ حسین ہے۔ بُلبُل پر حقیقت واضح ہو جاتی اور اس کی خوش فہمی دُور ہو جاتی ہے۔

۲۔ پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اگر نامہ بر میسر نہیں ہو سکا ہے تو اچھا ہی ہوا کہ غیر کی زبان سے اپنی آرزُو کا خلاصہ کیوں کر کرتے۔ اپنی آرزو کا اظہار اس کی زبان سے کیوں کر کرواتے۔

۳۔ مری طرح سے مہ وہ مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جُستجُو کرتے

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر نے صنعتِ حُسنِ تعلیل سے کام لیا ہے۔ سورج چاند گردش میں دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر نے اس کا شاعرانہ سبب بتایا ہے کہ وہ کسی کی تلاش میں آوارہ ہیں۔ لہٰذا وہ کہتا ہے کہ یہ بھی میری ہی طرح آوارہ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی کسی ہم دم کی تلاش میں ہیں۔

۴۔ جو دیکھتے تیری زنجیرِ زُلف کا عالم
اسیر ہونے کی، آزاد آرزو کرتے

تشریح:۔ شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب جو لوگ محبت میں گرفتار نہیں ہیں، آزاد ہیں اگر وہ ایک بار تمھاری پیچ دار حلقہ نُما زُلفوں کو دیکھ لیں تو اُنھیں آزاد ہونے پر افسوس ہو اور وہ ان زُلفوں میں قید ہونے کی خواہش کریں۔

۵۔ وہ جانِ جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی
دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے

تشریح:۔محبوب کی جُدائی میں دل وجگر کا جو حال ہوت اہے اس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں ہے۔اب شاعر کہتا ہے کہ اگر وہ جانِ جاں یعنی جان سے عزیز محبوب نہیں آتا تو کم از کم موت ہی آجاتی کہ ہم دل وجگر کو کہاں تک بھلا لہو کریں کہ اب برداشت سے باہر ہے۔

۶۔ نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتشؔ

برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

تشریح:۔شاعر کہتا ہے کہ اے آتشؔ ہماری بدنصیبی کا عالم مت پُوچھو کہ جس چیز کی ہم خواہش کریں اس کے برعکس ہوتا ہے۔اگر ہم بارش کی دُعا کریں تو اس کی جگہ آگ برسے۔ہماری طالع کی برگشتگی کا یعنی بدنصیبی کا یہ عالم ہے۔

Dr. Shyama Prasad Mukerjee University , Ranchi

BA Semester-1(2021-23)

URD-HC-101

10x3=30

مندرجہ ذیل میں سے کنہیں تین سوالوں کے مختصر جواب دیں۔

1- غزل کیا ہے؟ غزل کی تعریف بیان کیجئے۔

2- 'غزل کے آغاز وارتقا' پر مختصر نوٹ لکھیں۔

3- میر تقی میر کی حالاتِ زندگی پر مختصر روشنی ڈالیں۔

4- ولی دکنی کی شاعری پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔

5- آتش کی شاعری پر ایک نوٹ لکھیں۔

6- نصاب میں شامل کسی ایک غزل کے دو اشعار کی تشریح پیش کیجیے؟

25x2=50

درج ذیل میں سے کنہیں دو سوالوں کے تفصیلی جواب دیں۔

1- غزل کی تعریف، ہیت اور صنفی خصوصیات پیش کیجیے۔

2- ولی دکنی کی شاعری پر ایک نوٹ لکھیں۔

3- میر تقی میرؔ کی حالاتِ زندگی اور شاعری پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیں۔

4- آتشؔ کی شاعرانہ عظمت پر ایک نوٹ قلم بند کیجئے۔

5- ولیؔ کے کسی ایک غزل کے پانچ اشعار پیش کیجئے۔

6- نصاب میں شامل کسی ایک غزل کے پانچ اشعار کی تشریح پیش کیجئے۔